پروفیسر خالد شبیر احمد　　قسط نمبر ۴۷

ورق ورق زندگی

پروفیسر محمود قریشی مرحوم سے ملاقاتیں

ایک دفعہ ملتان جانے پر دارِ بنی ہاشم میں مولانا سید عطاء المحسن بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے کہ یہاں پڑوس میں ہمارے انتہائی مخلص دوست پروفیسر محمود قریشی مقیم ہیں۔ وہ گورنمنٹ کالج سول لائنز میں جہاں آپ پڑھاتے رہے ہیں آج کل اردو کے پروفیسر ہیں اور کئی بار آپ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کر چکے ہیں۔ انھوں نے آپ کے اور اس کالج میں جو آپ کا دور تھا اس کے متعلق بہت کچھ سن لیا ہے۔ اس دور میں جو کچھ آپ کرتے رہے ہیں اس سے بڑے متاثر نظر آتے ہیں۔ بار بار کہہ چکے ہیں کہ جب بھی خالد شبیر آئیں مجھے ان سے ملوائیں۔ میں نے کہا یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ وہ مجھ سے ملاقات کی جتنی خواہش رکھتے ہیں اب میں بھی ان سے ملنے کا اسی قدر ہی مشتاق ہوں۔ چنانچہ مولانا سید عطاء المحسن شاہ صاحب نے ان کے ہاں اطلاع بھجوائی، وہ سنتے ہی تشریف لے آئے۔ ہم کافی دیر تک عطاء المحسن شاہ صاحب کی ہم نشینی میں گفتگو کرتے رہے۔ یہ ان کے ساتھ میری پہلی ملاقات تھی۔ کہنے لگے کہ آپ کے قصے کالج کے کچھ اساتذہ کے ذریعے سنے تو حیران رہ گیا۔ کہ جب کبھی کالج میں طالب علم کسی معاملے میں ہڑتال کر دیتے تو آپ ان سے خطاب کرتے اور انھیں ہڑتال ختم کرنے پر آمادہ کر لیا کرتے تھے۔ آپ کیا واقعی اپنے طالب علموں میں اس قدر پسندیدہ اور مقبول تھے کہ آپ کی ہر بات ماننے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کالج کے پراکٹر ٹیم کے انچارج تھے اور ہاکی ٹیم کے بھی انچارج تھے؟ کیا واقعی آپ ایک دفعہ کسی جرم میں مطلوب لڑکے کے پیچھے بھاگ پڑے اور اسے ایم ڈی اے چوک میں آ کر پکڑا اور پرنسپل صاحب کے سامنے پیش کیا؟ میں نے کہا کہ یہ باتیں درست ہیں یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اس قسم کے کئی واقعات ہیں جن میں سے کچھ آپ نے کہیں سے سن لیے ہوں گے اور کئی مزید آپ کو سننے کو ملیں گے۔ فی الحال آپ اپنا تعارف کروائیں۔ پھر انھوں نے اپنا تعارف کریا۔ یہ میری ان کے ساتھ پہلی ملاقات تھی۔

لیکن میں نے اس پہلی ملاقات میں ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ ملاقاتیں انشاء اللہ جاری رہیں گی۔ میرا معاملہ یہ رہا ہے کہ میں کسی سے پہلی ملاقات میں ہی فیصلہ کر لیتا ہوں کہ دوسری دفعہ اس شخص سے ملنا ہے کہ نہیں۔ مجھے انھوں نے اپنی پہلی ملاقات میں ہی اپنے حسنِ اخلاق، بشاشتِ رُو اور تہذیب و ثقافت سے گرویدہ بنا لیا تھا۔ پھر اس کے بعد جب بھی میں ملتان گیا وہ مجھے دارِ بنی ہاشم میں قیام نہیں کرنے دیتے تھے بلکہ اپنے گھر پر ہی ٹھہراتے تھے۔ ہم چند ملاقاتوں میں ہی ایک دوسرے کے بے تکلف دوست بن گئے تھے۔ میرے خیال میں محمود قریشی مرحوم و مغفور ان تمام انسانی اوصاف سے مالا مال تھے جو دوستی، محبت، ہم نشینی اور دم سازی کی لطافتوں کا عطر ہیں۔ جب بھی میرا ملتان جانا ہوتا مجھے کسی نہ کسی تعلق دار کے ساتھ ملوانے کے لیے لے جاتے۔ کئی دفعہ جناب ڈاکٹر اسلم انصاری سے ملاقات ان کے ذریعے سے ہوئی۔ کئی دفعہ زکریا یونیورسٹی میں

لے گئے۔ جہاں ڈاکٹر انوار، جو اس وقت زکریا یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے ڈین تھے، ان سے ملوایا۔ میرے ان شاگردوں سے مجھے ملوایا جو اب خود ملتان کے معروف پروفیسروں میں شمار ہوتے تھے۔ ان حضرات کی تعظیم اور تعلیمی ترقی دونوں سے متاثر ہوا۔ کئی بار اپنے کالج لے گئے شعبہ اردو میں جناب عاصی کرنالی کے بیٹے ڈاکٹر شارق جاوید سے ملاقات کرائی۔ پروفیسر انور جمال سے ملوایا۔ ان سے میں پہلے ہی متعارف تھا کہ جب سید عطاء المحسن شاہ صاحب نے دارِ بنی ہاشم میں امیر شریعت کی یاد میں ایک تاریخی مشاعرہ کرایا تو انھوں نے بھی شاہ جی پر ایک بڑی خوبصورت اور دلکش نظم پڑھی تھی۔

پروفیسر محمود قریشی مرحوم، مولانا سید عطاء المحسن بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے عزم و ہمت اور فقر و جرأت و استغناء کے بہت سے چشم دید قصے بتاتے۔ وہ تو شاہ صاحب کے شیدائی تھے۔ دین کے لیے ان کی انتھک اور بے لوث محنت کی بات کرتے کرتے کبھی ان کی آنکھوں سے آنسو بھی ڈھلک پڑتے۔ پھر محسن شاہ صاحب کی اہلیہ محترمہ کی دین داری اور طالبان دین کی خدمت گزاری کا تذکرہ جس ادب اور احترام کے ساتھ کرتے وہ میری عقیدتوں میں اضافے کا سبب بنتا۔ وہ کہتے تھے کہ دارِ بنی ہاشم کی یہ ساری رونقیں ان دونوں میاں بیوی کی بے انتہا محنت کی مرہون منت ہیں۔ ان دونوں نے انتہائی مشکل اور نامساعد حالات میں بھی اپنی محنت کو جاری رکھا۔ ان کو دین اور دینی کاموں سے عشق تھا۔ کہتے تھے کہ محسن شاہ صاحب کی اہلیہ محترمہ تمام طلباء کی روٹیاں اپنے ہاتھ سے پکاتی تھیں۔ اور طالب علموں کی ضروریات کو پورا کرتیں۔ خاص طور پر محسن شاہ صاحب کسی دورے پر گھر سے باہر ہوتے تو یہ تمام کچھ ان کے لیے اور زیادہ مشکل ہو جاتا۔ لیکن مجال ہے کہ ان کے عزم میں کسی قسم کی کوئی جھول آ جائے۔ مجھے جب بھی محسن شاہ صاحب کی عدم موجودگی میں کوئی کام کہتیں تو میں اپنی تمام مصروفیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سعادت اور ذخیرۂ آخرت سمجھ کر کام کو کرتا اور خوشی ہوتی کہ دین کے کام میں میرا بھی حصہ پڑ جاتا ہے۔ میں ان کی ہمسائیگی میں رہ کر دین اور دینی تقاضوں سے متعارف ہوا ہوں۔ یہ دونوں میاں بیوی میرے محسن ہیں۔

ایک دفعہ انھوں نے مجھے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کروں لیکن مجھے جناب اسلم انصاری سے اس سلسلے میں تعاون و رہنمائی کی ضرورت ہوگی اور ڈاکٹر انور احمد شعبے کے ڈین ہیں۔ ڈاکٹر انوار کا مجھ سے تلمذ کا تعلق تھا جبکہ جناب ڈاکٹر اسلم انصاری میرے ہمکار بھی رہے اور ایسے بھی کرم فرماتے رہتے تھے۔ میں نے کہا میرا ٹیلی فون پر دونوں سے رابطہ کراؤ۔ پہلے ڈاکٹر اسلم انصاری سے بات ہوئی کہ ڈاکٹر انوار سے ملاقات کرنی ہے اور آپ کو ساتھ لے کر جانا ہے کہنے لگے میرا تو آج کل ان سے کچھ زیادہ ربط ضبط نہیں بلکہ ہمارے درمیان کسی قدر فاصلہ ہے۔ میں نے کہا کہ اسی لیے تو آپ کو ساتھ لینا ہے کہ آپ کا ان کے ساتھ تعلق بہتر ہو۔ چنانچہ وہ راضی ہو گئے تو میں نے محمود قریشی سے کہا کہ اب ڈاکٹر انوار سے فون پر بات کراؤ ان سے بات ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں لیکن یونیورسٹی میں نہیں آپ کے گھر پر۔ کہنے لگے چشم ما روشن دل ما شاد۔ کل آپ ناشتہ میرے ساتھ ہی کریں۔ میں نے کہا کہ میرے ساتھ پروفیسر محمود قریشی اور اسلم انصاری بھی ہوں گے۔ کہنے لگے اسلم انصاری آ جائیں گے؟ میں نے کہا کہ میں درخواست کروں تو وہ عزت افزائی فرماتے ہیں۔ چنانچہ دوسرے دن ہم تینوں ڈاکٹر انوار کے گھر پہنچے تو اس نے خندہ پیشانی سے ہمارا

استقبال کیا، ناشتہ کیا۔ ملاقات کافی دیر تک جاری رہی۔ پہلے ڈاکٹر اسلم انصاری اور ڈاکٹر انوار کے درمیان جو تھوڑا سا فاصلہ تھا وہ دور کیا اور پھر جس غرض کے لیے گئے تھے وہ بیان کی تو دونوں نے حامی بھری۔ اسلم انصاری نے کہا کہ پی۔ ایچ۔ڈی کا عنوان تو یونیورسٹی نے دینا ہے۔ میں ہر ممکن مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اب بات موضوع وعنوان کی آپڑی، محمود قریشی مرحوم ومغفور حضرت امیرِ شریعت کی ضرب المثل خطابت کے حوالے سے کوئی کام کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا کہ آپ تینوں ملتانی ہیں کیا آپ امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کو ملتانی تسلیم کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ ہم انھیں صرف ملتانی تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ ان کے ملتانی ہونے پر ہمیں فخر ہے۔ میں نے کہا کہ کیوں نہ ان کی ذات گرامی پہ ہی کسی عنوان سے یہ کام شروع کریں۔ بس طے ہوگیا کہ اس حوالے کو ملحوظ رکھا جائے۔ چنانچہ بہاءالدین زکریا یونیورسٹی سے انھیں ''اردو ادب اور خطابت کی روایت میں سید عطاءاللہ شاہ بخاری کا مقام'' کے عنوان پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی باقاعدہ اجازت دے دی گئی اور محمود قریشی مرحوم نے اس عنوان پر کام شروع کر دیا تھا۔ ایک دو باب بھی مکمل کر لیے تھے، میں کبھی جاتا تو مجھے سناتے۔ میں متاثر بھی ہوتا اور خوش بھی، لیکن ابھی یہ کام جاری تھا کہ محمود صاحب مرحوم کینسر ایسی بیماری میں مبتلا ہوگئے کہ علاج کے باوجود صحت یاب نہ ہو سکے اور ہم سب لوگوں کو چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہوگئے۔ جب کبھی ان کی یاد آتی ہے تو یہ شعر بے ساختہ میری یادوں کی ترجمانی بنتے ہیں:

شوخیِ حرف و سخن یاد آئی — لذّتِ کام و دہن یاد آئی
درد کے تپتے ہوئے صحرا میں — وہ محبت وہ لگن یاد آئی
ابھرا بے ربط خیالوں میں کوئی — ظلمتِ شب میں کرن یاد آئی
اک سراپا سرِ ادراک فروزاں دیکھوں — دل کے آنگن میں کھلا عہدِ بہاراں دیکھوں
افقِ ذہن پہ ابھرا شبِ ہجراں کا الم — وقت کی دار پہ ہر دور کو رقصاں دیکھوں
جب یاد آتے ہیں خالد مجھے بچھڑے ساتھی — کچھ ستارے سے چمکتے سرِ مژگاں دیکھوں

اگر میں اپنی آپ بیتی میں پروفیسر محمود قریشی کا ذکر نہ کرتا تو میری کہانی ادھوری رہ جاتی۔ جی تو چاہتا ہے کہ کچھ اور بھی ان کے بارے میں لکھتا لیکن اسی پر اکتفا کرتا ہوں اور ایک مضمون بلکہ ایک خاکہ ان کا، جو انھوں نے میرے بارے میں تحریر کیا تھا اور میرے پاس محفوظ رہ گیا وہ نذر قارئین کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ انھوں نے اس کا عنوان ''پروفیسر خالد شبیر احمد رحمۃ اللہ علیہ'' رکھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے میری شکل وصورت میرا لباس، میری وضع قطع جو اس کالج کے پرانے اساتذہ سے سنی تھی مجھے اس سے مختلف حالت میں دیکھا۔ لباس تبدیل ہوگیا، جوانی ڈھل گئی، منہ پر ڈاڑھی، شلوار قمیص لباس تھا تو انھوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ وہ خالد شبیر رحمۃ اللہ علیہ ہوگیا۔ مضمون کے شروع میں ان کا اشارہ اس طرف ہے جب میں نے اپنی غزلوں کی کتاب ''خواب خواب روشنی'' شائع کی تو کچھ کتابیں ان کے کالج کے اساتذہ کو بھی تقسیم کی تھیں۔ تحریر پیش کرتا ہوں:

پروفیسر خالد شبیر رحمتہ اللہ علیہ

''سٹاف روم میں داخل ہوا تو پروفیسر خالد شبیر احمد کے قہقہے گونج رہے تھے نئے اور پرانے ساتھیوں میں کتابیں بانٹ رہے تھے۔ اپنے دور کے واقعات سنا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر خوشی سے اٹھے اور ملے اور پھر اسی طرح دوستوں میں گھل مل کر باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں میرا ایک رفیق کار میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا۔ یہ پروفیسر خالد شبیر ہیں۔ میں نے کہا ہاں ہاں وہی ہیں۔ وہ ماضی کے جھروکے میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ہم بھی ان کے شاگرد تھے۔ کتنے سمارٹ تھے پروفیسر صاحب۔ پینٹ شرٹ میں ملبوس، ہاتھ میں سگریٹ لیے ..... یہ سامنے ٹینس لان میں ٹہلتے تھے۔ پروفیسر صاحبان اور شاگردان کے گرد ہوتے۔ ان کی ریش مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے اب تو بس رحمتہ اللہ علیہ ہو گئے ہیں۔

پروفیسر خالد شبیر احمد سے غائبانہ تعارف میرے ایک عزیز نے کرایا جو ان کا ذکر بڑی سِک اور محبت سے کرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ جو لڑکا خالد شبیر صاحب کی کلاس میں چلا جاتا وہ اچھے نمبروں سے پاس ہو جاتا۔ جبکہ ہماری کلاس میں جو لڑکا نہ آئے وہ اچھے نمبر لے جاتا تھا۔ آخر ہم پروفیسر عبدالرؤف کے شاگرد جو ہوئے۔ ان کی کئی تصانیف نظروں سے گزریں تو معلوم ہوا کہ پکے احراری ہیں۔ لیکن ان سے ملنے کا اشتیاق اس وقت زیادہ ہوا جب ڈاکٹر انوار احمد نے اپنی ایک کتاب کا انتساب ان کے نام کیا:

عظمتیں ان کا مقدر ہوگئیں جن کو نسبت ہو گئی احرار سے

اور بقول انوار احمد ان کی گاڑی کا کانٹا پروفیسر عبدالرؤف شیخ نے تبدیل کر دیا۔ جبکہ جناب شیخ اس مولوی کو مورِ دِالزام ٹھہراتے ہیں جس نے وضو کے پانی کی ٹوٹی نہ بند کرنے کی پاداش میں انھیں مسجد سے نکال دیا تھا۔

فرزندانِ امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ میری دیوار بیچ پڑوسی ہیں اس آستانے پر بڑے بڑے خوفناک علماء اور فضلاء حاضریاں دیتے ہیں۔ سید عطاء المحسن شاہ جی ان روایتی مولویوں سے بالکل برعکس ہیں۔ شاہ جی لطیفے سناتے ہیں، اشعار پڑھتے ہیں اور قہقہے لگاتے ہیں۔ ان کی اس محفل میں بڑے بڑے شاعروں ادیبوں اور پروفیسروں سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ ایک دن میں شاہ جی کے ہاں گیا تو فرمانے لگے یہ ہیں خالد شبیر جن کے بارے میں آپ اکثر پوچھتے ہیں۔ میں خالد صاحب کی ظاہری ہیئت ترکیبی دیکھ کر سہم سا گیا۔ لیکن جلد ہی احساس ہو گیا کہ خالد صاحب ایک سچے اور کھرے محبت کرنے والے استاد ہیں۔ اس سلسلے میں، میں شاہ جی کا شکر گزار ہوں کہ ان کے ہاں میری دو ایسی شخصیات سے ملاقات ہوئی جن کو میں تمام زندگی نہیں بھول سکتا۔ پروفیسر مسعود تابش اور پروفیسر خالد شبیر احمد دونوں بڑے پڑھے لکھے شاعر اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ جن دنوں خالد شبیر گورنمنٹ کالج سول لائن میں پڑھاتے تھے۔ ڈاکٹر انوار احمد اور ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ صاحب ان سے پڑھتے تھے۔ ان دنوں نابغۂ روزگار اور نامور پروفیسر حضرات اس کالج میں پڑھاتے تھے۔ جن میں پروفیسر جابر علی سید، پروفیسر عبدالخالق عزمی، پروفیسر تاثیر وجدان اور پروفیسر اسلم انصاری کے نام نمایاں ہیں۔ اس کالج کی کینٹین علم وادب کی بحث کے لیے مشہور تھی اور دوسرے کالج کے لوگ صرف ان لوگوں کی باتیں سننے

یہاں آیا کرتے تھے۔ اس کالج میں اس دستے کے صرف دوشہ سوار ہی بچ گئے ہیں۔ پروفیسر محمد امین اور پروفیسر انور جمال۔ ڈاکٹر محمد امین سے ہائیکو سنتے ہوئے تیسرے مصرع کے بعد ویسے ہی ہنسی نکل جاتی ہے اور انور جمال کے پڑھاتے پڑھاتے اعضاء گھسنے لگتے ہیں۔ وہ ہر وقت دعا گو ہیں۔

توئی عاصیاں را خطا بخش و بس

خالد صاحب کی شاعری پر تنقیدی رائے تو پروفیسر اسلم انصاری جیسے عظیم المرتبت ہی دے سکتے ہیں۔ جنھوں نے اس دشت کی سیاحی میں عمریں گزار دیں۔ ہمیں تو بس ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ صاحب کا حکم تھا کہ تم نے ضرور لکھنا ہے کبھی استادوں کی عزت بھی رکھ لیا کرو۔ اس سے زیادہ اور عزت کا پاس کیا کریں؟ گھنٹوں انصاری صاحب کے پاس خاموش بیٹھے رہتے ہیں مبادا منہ سے کوئی غلط جملہ نکل جائے اور انصاری صاحب یہ پوچھ بیٹھیں کہ میاں ''یہ کس مکتب کی کرامت ہے'' بھلا ہم خالد صاحب کی ایمان افروز شاعری پر کیا رائے دے سکتے ہیں۔ ہمارا کبھی دل اداس ہوا تو اللہ بخشے پروین شاکر کے اشعار پڑھ لیتے ہیں۔ اسی لیے تو حکیم طاہر تونسوی صاحب نے ہمارے لیے نسخہ تجویز کیا تھا کہ صبح نہار منہ نوشی گیلانی کی غزل کے دو اشعار اور سونے سے پہلے فہمیدہ ریاض کی نظم پڑھ لیا کرو ذہنی دباؤ کا شکار کبھی نہ ہو گے۔ میں نے پوچھا کوئی پرہیز کہنے لگے بہار النساء بہار سے فی الحال پرہیز ضروری ہے۔

خواب خواب روشنی میں جو اشعار خالد شبیر رحمتہ اللہ علیہ نے لکھے ہیں وہ روح پر اثر کرتے ہیں۔ مثلاً

رشک آتا ہے اُس اسیری پر وہ جو عہد شباب میں کاٹی
کون واقف ہے اس اذیت سے پھول نے جو کتاب میں کاٹی

یا پھر

مصحفِ رخ پہ کاکلِ مشکیں روزِ روشن میں رات دیکھی ہے
لبِ لعلیں میں، چشم میگوں میں موت دیکھی، حیات دیکھی ہے
جانے کیا بات کرتے ہو خالدؔ جانے کیا واردات دیکھی ہے

خالد صاحب کتنی حیا والے ہیں واردات کرتے نہیں صرف لکھتے ہیں۔ ایک دن جابر علی سید صاحب خالد شبیر صاحب کے پاس آئے کہنے لگے ہماری دوستی کی کیا وجہ ہے۔ حالانکہ ہم میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ خالد صاحب نے کہا آپ بتائیں کہنے لگے میں کل سوچ کر بتاؤں گا۔ دوسرے دن آئے تو کہنے لگے۔ کل میں سوچتا رہا آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ یار تو بڑا وضع دار آدمی ہے۔

میرے خیال میں خالد صاحب بڑے مزاج شناس ہیں لوگوں سے ان کے مزاج کے مطابق بات کرتے ہیں مگر ایک سچے اور کھرے انسان کی طرح کھری کھری بھی سنا دیتے ہیں ؎

خالد یہ ہے ان کی دنیا جو ہیں ذہن سے خالی لوگ حکمِ غلط بھی مانیں جو ان رانی خاں کے سالوں کا''

ان سطور کی لکھنے کی ضرورت اس لیے بھی ہوئی کہ ان کا یہ خاکہ یا مضمون تبرکاً میری آپ بیتی میں محفوظ ہو جائے۔

محسنِ احرار سید عطاء المحسن بخاری رحمۃ اللہ علیہ:

سید عطاء المحسن بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو بھی میں نے ''احرار دفاع کانفرنس'' جنوری ۱۹۴۹ء کے موقعہ پر پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ وہ دفتر احرار لاہور میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے کہا کہ یہ امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے بیٹے ہیں۔ اس وقت میری عمر تقریباً پندرہ برس کی تھی اور میں اس کانفرنس میں چنیوٹ کے احرار جیش کے ہمراہ شامل ہوا تھا۔ اس وقت محسن شاہ صاحب کی عمر غالباً تیرہ برس کی تھی۔ جب ان سے بعد میں تعلق خاطر ہوا تو انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ ان کا سنِ پیدائش ۱۹۳۶ء ہے۔ اس طرح وہ مجھ سے عمر میں دو برس چھوٹے ہوئے۔ اس کانفرنس کے بعد بہت عرصے تک میں نے انھیں نہیں دیکھا۔ جب میں اکتوبر ۱۹۶۲ء میں ملتان گورنمنٹ کالج سول لائن میں تعینات ہوا، تو ان سے باقاعدہ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اگر مجھ سے ان کے بارے میں کوئی پوچھے تو میں صرف یہ کہوں گا کہ وہ میرے بہت اچھے دوست تھے۔ جتنی پذیرائی مجھے ان سے ملی کسی دوسرے احرار سے متعلق فرد سے نہیں۔ ان کے خلوص ان کی محبت اور ان سے دوستی پر مجھے فخر ہے۔ ملتان میں پہلے پہل انھوں نے مجھے اپنے دوستوں سے متعارف کرایا۔ ''دہلی مسلم ہوٹل'' میں مجھے لے گئے جہاں پر ملتان شہر کے بڑے بڑے شاعر اور ادیب روزانہ اپنی محفل لگاتے اور علم و فضل کے ترانے گاتے۔ ان کی محفل میں بیٹھنے سے مجھے بہت کچھ حاصل ہوا۔ محسن شاہ صاحب سول لائنز کے اساتذہ کے ساتھ اسی طرح ملتے جس طرح وہ مجھ سے ذاتی محبت اور تعلق رکھتے تھے۔ جابر علی سید، عبدالخالق عزمی، عابد صدیق، عبدالرحمٰن شاکر، اسلم انصاری یہ سب محسن شاہ جی کے دوست تھے۔

میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ میری جماعتِ احرار سے وفاداری سے متاثر تھے۔ اور اسی طرح میری قدر افزائی اور عزت نوازی میں بھی وہ باقی اہم احرار شخصیتوں میں سب سے آگے تھے۔ خود میں بھی ان کے اس جوہر کی وجہ سے ان کا شیدائی رہا کہ ان کے رگ و ریشہ میں احراریت خون کی طرح دوڑتی تھی اور جماعت کے استحکام و ترقی میں ان کا حصہ غیر معمولی ہے۔ وہ احرار کے نہ تھکنے والے فقط رہنما ہی نہ تھے بلکہ رضا کار بھی تھے۔ رضا کار اور رہنما میں آخر کچھ نہ کچھ فرق تو ہوتا ہی ہے لیکن ان کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو جتنے بڑے احرار کے رہنما تھے اس سے کہیں بڑھ کر وہ احرار کے رضا کار تھے۔ رضا کاروں کی تربیت میں انھیں خصوصی مہارت حاصل ہوگئی تھی۔ اپنے بھانجے سید کفیل بخاری کو انھوں نے بچپن سے ہی اپنی تربیت میں لے لیا تھا، اب وہ جماعت میں ایک منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ کفیل بخاری خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ فکری و عملی تربیت میں وہ اپنے ماموں سید عطاء المحسن بخاری کے ہمیشہ احسان مند رہیں گے۔ امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے کوئی کتاب بھی تصنیف کی؟ جواب میں امیر شریعت نے کہا کہ ہاں، نام پوچھا تو فرمایا قاضی احسان احمد شجاع آبادی۔ ذرا میری نظر سے اس کتاب کو پڑھنا یہ کتاب کتنی دلکش اور خوش کن کتاب ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے محسن شاہ جی کی کتاب ''کفیل بخاری'' ہیں اور یہ کتاب بھی اپنی خوبصورتی اور دل کشی کے لحاظ سے منفرد کتاب ہے۔

دارِ بنی ہاشم کی یہ رونقیں محسن شاہ جی کی مرہون منت ہیں انھوں نے ایسے کئی کام کیے کہ نہ صرف ملتان شہر کی توجہ اس مرکز کی طرف ہے اور ملک بھر میں اس مرکز کی حیثیت ایک مسلمہ حقیقت بن چکی ہے، دینی مدرسہ کا آغاز، لڑکیوں کے مدرسے، مسجد کی تعمیر، دفتر میں ضروری تمام لوازمات لائبریری اور پھر ''نقیب ختم نبوت'' کا اجراء یہ سب کچھ انھیں کے زریں کارنامے ہیں۔ مجھے کفیل بخاری نے خود بتایا کہ جب ''نقیب ختم نبوت'' کی اشاعت کو کچھ عرصہ ہو گیا تو میں نے عرض کیا کہ رسالہ تو خسارے میں جا رہا ہے۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں، خسارہ بھی پورا ہوگا اور اگر آج یہ خسارے میں ہے تو سمجھ لو کہ تین چار ہزار روپے کا جماعت نے ایک مبلغ رکھا ہوا ہے اور یہ خسارہ اس کی تنخواہ ہے۔ یہ رسالہ جن ہاتھوں میں جائے گا جماعت کی تبلیغ ہی کرے گا۔ ابتداء میں بڑے تسلسل کے ساتھ یوم امیر شریعت بھی دارِ بنی ہاشم میں منایا جاتا تھا۔ جس میں ملک بھر سے احرار رضا کار اور علماء حضرات تشریف لاتے اور دارِ بنی ہاشم کی رونق کا حصہ بنتے۔ اسی طرح ہر سال یوم حسینؓ بھی مجلس ذکر حسین کے عنوان سے کئی دہائیوں سے باقاعدہ محرم کے مہینے میں اسی دارِ بنی ہاشم میں ہی منایا جاتا ہے۔ دارِ بنی ہاشم کی جامع مسجد ختم نبوت میں باقاعدہ نماز اور جمعہ کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ شروع شروع میں حضرت الامام مولانا سید ابوذر بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے محسن شاہ جی کے ساتھ مشورے سے ہی نمازِ جمعہ کا آغاز کیا تھا۔ اُس وقت ابھی مسجد کی تعمیر نہیں ہوئی تھی، میدان میں ہی جمعہ کی نماز پڑھائی جاتی تھی۔

پورے ملک کے اندر محسن شاہ جی نے جماعتی دوروں کا اہتمام بڑے تسلسل کے ساتھ جاری رکھا۔ دور دراز کے دیہاتوں تک سائیکل پر بھی جانا پڑا حتیٰ کہ پیدل بھی سفر کیے اور جماعت کی تشکیلِ نو کی وہ ایک ان تھک انسان تھے۔ دینی بیداری کی خاطر جماعتی استحکام کے لیے انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے پوری طرح کام لینے میں کبھی تساہل نہیں برتا۔

چنیوٹ میں نئے دفتر کے قیام اور پھر جماعت کو متحرک اور مستحکم بنانے میں بھی ان کا غیر معمولی حصہ ہے۔ دفتر میں اکثر تشریف لاتے رضا کاروں کو اکٹھا کرتے ان کے درمیان میں بیٹھ کر دین، اہل دین، جماعت اور اکابر احرار کے بارے میں گفتگو کرتے۔ انھیں احرار رضا کاروں سے محبت تھی۔ رضا کاروں کے لیے ان کا اپنا کردار مثال تھا۔ اقبال نے کہا ؎

نگہ بلند سخن دل نواز جاں پر سوز یہی ہے رختِ سفر میر کاروں کے لیے

نگاہ کی بلندی اور جاں کی پرسوزی دھری کی دھری رہ جاتی ہے اگر سخن میں دل نوازی کا جوہر نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں سخن کی دل نوازی کا وصف بھی وافر عطا کیا تھا۔ وہ متحمل مزاج بھی تھے اور بردبار بھی۔ انھی اوصاف نے ان کی شخصیت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ ان کی تحریر ہو کہ تقریر دونوں میں انفرادیت تھی۔ جلسہ گاہ میں تقریر کرتے ہوئے جب قرآن کی تلاوت فرماتے تو امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ کی تلاوت یاد آجاتی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ لوگ ان کی تلاوت سے اس قدر متاثر ہوتے کہ بے ساختہ آنسوؤں سے انھیں خراج تحسین پیش کرتے۔ ان کی تحریر میں بلا کی کاٹ تھی اور تقریر میں للکار کا جوہر وافر تھا۔ وہ فصاحت و بلاغت کے وصف سے بھی متصف تھے۔ انھوں نے شورش کاشمیری کی طرح اردو ادب کو منفرد لہجے اور انوکھے الفاظ سے متعارف کرایا۔ ''روزنامہ خبریں'' میں انھوں کالم لکھنا شروع کیا تو جو اسلوب انھوں نے برتا اور جو شاندار و پرشکوہ ڈکشن انھوں نے قارئین کے سامنے پیش کیا وہ یک سر غیر معمولی تھا۔ (جاری ہے)